سرمایہ داری، اشتراکیت

اور

اسلام

مولانا سیّد ابوالاعلیٰ مودودیؒ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

سرمایہ داری، اشتراکیت اور اسلام

نظامِ سرمایہ داری

نظام سرمایہ داری کی بنیاد جس نظریہ پر قائم ہے وہ صاف اور سادہ الفاظ میں یہ ہے کہ ہر شخص اپنے کمائے ہوئے مال کا تنہا مالک ہے۔ اس کی کمائی میں کسی کا کوئی حق نہیں۔ اس کو پورا اختیار ہے کہ اپنے مال میں جس طرح چاہے تصرّف کرے۔ اور وہ حق رکھتا ہے کہ جس قدر وسائلِ ثروت اس کے قابو میں آئیں، ان کو روک رکھے، اور اپنی ذات کے لیے کوئی فائدہ حاصل کیے بغیر ان کو صَرف کرنے سے انکار کردے۔ یہ نظریہ اس خودغرضی سے شروع ہوتا ہے جو ہر انسان کی فطرت میں ودیعت کی گئی ہے اور آخرکار اس انتہائی خودغرضی تک پہنچ جاتا ہے جو انسان کی ان تمام صفات کو دبا دیتی ہے جن کا وجود انسانی جماعت کی فلاح و بہبود کے لیے ضروری ہے۔ اگر اخلاقی نقطۂ نظر کو چھوڑ کر خالص معاشی نقطۂ نظر سے بھی دیکھا جائے تو اس نظریہ کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ تقسیم ثروت کا توازن بگڑ جائے، وسائلِ ثروت رفتہ رفتہ سمٹ کر ایک زیادہ خوش قسمت یا زیادہ ہوشیار طبقے کے پاس جمع ہو جائیں اور سوسائٹی عملاً دو طبقوں میں تقسیم ہو جائے، ایک مالدار، دوسرا نادار۔ مالدار طبقہ تمام وسائلِ ثروت پر قابض و متصرّف ہو کر ان کو محض اپنے ذاتی مفاد کے لیے استعمال کرنے اور اپنی دولت کو زیادہ سے زیادہ بڑھانے کی کوشش میں سوسائٹی کے مجموعی مفاد کو جس طرح چاہے قربان کر دے۔ رہا نادار طبقہ تو اس کے لیے وسائلِ ثروت میں سے حصہ پانے کا کوئی موقع نہ ہو، اِلّا یہ کہ وہ سرمایہ دار کے مفاد کی زیادہ سے زیادہ خدمت کر کے زندگی بسر کرنے کا کم سے کم سامان حاصل کرے۔ ظاہر ہے کہ اس قسم کا نظم معیشت ایک طرف ساہوکار، کارخانہ دار اور زمیندار پیدا کرے گا اور دوسری طرف مزدور کسان اور قرض دار۔ ایسے نظام کی عین فطرت اس کی مقتضی ہے کہ سوسائٹی سے ہمدردی اور امداد باہمی کی اسپرٹ مفقود ہو۔ ہر شخص

بالکلیہ اپنے ذاتی وسائل پر زندگی بسر کرنے پر مجبور ہو، کوئی کسی کا یار و مددگار نہ ہو، محتاج کے لیے معیشت کا دائرہ تنگ ہو جائے۔ سوسائٹی کا ہر فرد بقائے حیات کے لیے دوسرے افراد کے مقابلے میں معاندانہ جدوجہد کرے۔ زیادہ سے زیادہ وسائلِ ثروت پر قابو پانے کی کوشش کرے، اپنے مفاد کے لیے ان کو روک رکھے اور صرف ازدیادِ ثروت کے لیے انہیں استعمال کرے۔ پھر جو لوگ اس جدّ و جہد میں ناکام ہوں۔ یا اس میں حصّہ لینے کی قوت نہ رکھتے ہوں، ان کے لیے دنیا میں کوئی سہارا نہ ہو، وہ بھیک مانگیں تو ان کو آسانی نہ مل سکے، کسی دل میں ان کے لیے رحم نہ ہو، کوئی ہاتھ ان کی مدد کو نہ بڑھے۔ یا تو وہ خودکشی کر کے زندگی کے عذاب سے نجات حاصل کریں یا پھر جرائم اور بے حیائی کے ذلیل طریقوں سے پیٹ پالنے پر مجبور ہوں۔

سرمایہ داری کے اس نظام میں ناگزیر ہے کہ لوگوں کا میلان روپیہ جمع کرنے کی طرف ہو، اور وہ اس کو صرف پیدا آور اغراض کے لیے استعمال کرنے کی سعی کریں۔ مشترک سرمایہ کی کمپنیاں قائم کی جائیں، بینک کھولے جائیں، پراویڈنٹ فنڈ قائم ہوں، انشورنس کمپنیاں بنائی جائیں، امداد باہمی کی جمعیتیں مرتب کی جائیں اور ان تمام مختلف معاشی تدبیروں میں ایک ہی روح کام کرے، یعنی روپیہ سے مزید روپیہ پیدا کرنا، خواہ وہ تجارتی لین دین کے ذریعے سے ہو یا سود کے ذریعے سے ہو۔ سرمایہ داری کے نقطۂ نظر سے سود اور تجارتی لین دین کے درمیان کوئی جوہری فرق نہیں ہے۔ اس لیے نظامِ سرمایہ داری میں یہ دونوں ایک دوسرے کے ساتھ نہ صرف خلط ملط ہو جاتے ہیں بلکہ کاروبار کی ساخت میں ان کی حیثیت تانے بانے کی سی ہوتی ہے۔ تجارت کے لیے سود اور سود کے لیے تجارت لازم و ملزوم ہیں اور ان میں سے کسی کو دوسرے کے بغیر فروغ نہیں ہو سکتا۔ اگر سود نہ ہو تو سرمایہ داری کا تار پود بکھر جائے۔

نظامِ اشتراکی

سرمایہ داری کے عین مطابق ایک دوسرا نظام معیشت ہے جس کو اشتراکی نظام کہتے ہیں۔ اس کی بنیاد اس نظریہ پر ہے کہ تمام وسائلِ ثروت سوسائٹی کے درمیان مشترک ہیں۔ اس لیے افراد کو فرداً فرداً ان پر مالکانہ قبضہ کرنے اور اپنے حسب منشا ان میں تصرف کرنے اور ان کے منافع سے تنہا متمتع ہونے کا کوئی حق نہیں۔ اشخاص کو جو کچھ ملے گا وہ محض ان خدمات کا معاوضہ

ہوگا جو سوسائٹی کے مشترک مفاد کے لیے وہ انجام دیں گے۔ سوسائٹی ان کے لیے ضروریات زندگی فراہم کرے گی اور وہ اس کے بدلہ میں کام کریں گے۔

یہ نظریہ ایک دوسرے ڈھنگ پر معیشت کی تنظیم کرتا ہے جو بنیادی طور پر نظامِ سرمایہ داری سے مختلف ہے۔ اس تنظیم میں سرے سے ملکیتِ شخصی ہی کا وجود نہیں، پھر کہاں اس کی گنجائش کہ کوئی روپیہ جمع کرے اور اس کو بطور خود کاروبار میں لگائے۔ یہاں چوں کہ نظریے اور اصول میں اختلاف ہوگیا ہے، اس لیے مناہج بھی بدل گئے ہیں۔ سرمایہ داری کا کارخانہ، بینکنگ، انشورنس، شرکت ہائے اسہامی (Joint Stock Companies) اور ایسے ہی دوسرے اداروں کے بغیر نہیں چل سکتا۔ لیکن اشتراکیت کی ساخت اور اس کے معاشی معاملات میں نہ ان اداروں کی گنجائش ہے نہ ضرورت۔ سرمایہ داری کے مزاج سے سود کو جتنی گہری مناسبت ہے اشتراکیت کے مزاج سے اس کو اتنی ہی زیادہ شدید ناموافقت ہے۔ اشتراکیت اس چیز کی بنیاد ہی پر مسمار کردیتی ہے جس کی بنا پر ایک شخص سود لیتا اور دوسرا شخص سود دیتا ہے۔ اس کے اصول کسی شکل اور کسی حیثیت میں بھی سود کو جائز نہیں رکھتے۔ اور جو شخص ان اصولوں پر ایمان رکھتا ہو اس کے لیے ممکن نہیں کہ بیک وقت اشتراکی بھی ہو اور سودی لین دین بھی کرے۔(۱)

اشتراکیت اور سرمایہ داری ایک دوسرے کے خلاف دو انتہائی نقطوں پر ہیں۔ سرمایہ داری افراد کو ان کے فطری حقوق ضرور دیتی ہے مگر اس کے اصول و نظریات میں کوئی ایسی چیز نہیں جو افراد کو جماعت کے مشترک مفاد کی خدمت کے لیے آمادہ کرنے والی اور تاحدِ ضرورت اس پر مجبور کرنے والی ہو، بلکہ درحقیقت وہ افراد میں ایک ایسی خودغرضانہ ذہنیت پیدا کرتی ہے جس سے ہر شخص اپنے مفاد کے لیے جماعت کے خلاف عملاً جنگ کرتا ہے، یہاں تک کہ تقسیم ثروت کا توازن بالکل بگڑ جاتا ہے۔ ایک طرف چند خوش نصیب افراد پوری جماعت کے وسائلِ ثروت کو سمیٹ کر لکھ پتی اور کروڑ پتی بن جاتے ہیں اور اپنے سرمایہ کی قوت سے مزید دولت کھینچتے چلے جاتے ہیں۔ دوسری طرف جمہور کی معاشی حالت خراب سے خراب تر ہوتی چلی جاتی ہے اور دولت کی تقسیم میں

(۱) واضح رہے کہ یہاں ہم خالص نظریے سے بحث کر رہے ہیں ورنہ عملاً اشتراکی نظام نے روس میں بہت پلٹیاں کھائی ہیں۔ اور اپنے انتہاپسندانہ نظریات کو عملی جامہ پہنانے میں ناکام ہوکر وہ سرمایہ داری کے مختلف طریقوں کی طرف عود کرتا چلا گیا ہے۔ چنانچہ اب وہاں ان لوگوں کے لیے جو اپنی ضرورت سے زیادہ معاوضے پاتے ہیں، یہ ممکن ہوگیا ہے کہ اپنی زائداز ضرورت آمدنی کو جمع کریں، اسے بینک میں رکھیں اور سود پر چلائیں۔

ان کا حصہ گھٹتے گھٹتے بمنزلۂ صفر رہ جاتا ہے۔ ابتدا میں سرمایہ داروں کی دولت اپنے شاندار مظاہر سے تمدّن میں ایک نظر فریب چمک دمک تو ضرور پیدا کر دیتی ہے مگر دولت کی غیر متوازن تقسیم کا آخری انجام اس کے سوا کچھ نہیں کہ معاشی دنیا کے جسم میں دورانِ خون بند ہو جائے اور جسم کے اکثر حصّے، قلتِ خون کی وجہ سے سوکھ کر تباہ ہوں اور اعضاء رئیسہ کو خون کا غیر معمولی اجتماع تباہ کر دے۔

اشتراکیت اس خرابی کا علاج کرنا چاہتی ہے مگر ایک صحیح مقصد کے لیے غلط راستہ اختیار کرتی ہے۔ اس کا مقصد تقسیم ثروت میں توازن قائم کرنا ہے اور یہ بلاشبہہ صحیح مقصد ہے، مگر اس کے لیے وہ ذریعہ ایسا اختیار کرتی ہے جو درحقیقت انسانی فطرت سے جنگ ہے۔ افراد کو شخصی ملکیت سے محروم کر کے بالکل جماعت کا خادم بنا دینا نہ صرف معیشت کے لیے تباہ کن ہے بلکہ زیادہ وسیع پیمانے پر انسان کی پوری تمدّنی زندگی کے لیے مہلک ہے کیوں کہ یہ چیز معاشی کاروبار اور نظامِ تمدّن سے اس کی روح رواں اس کی اصل قوتِ محرکہ کو نکال دیتی ہے۔ تمدّن و معیشت میں انسان کو جو چیز انتہائی قوت کے ساتھ سعی و عمل کرنے پر ابھارتی ہے وہ دراصل اس کا ذاتی مفاد ہے۔[۱] یہ انسان کی فطری خود غرضی ہے، جس کو کوئی منطق اس کے دل و دماغ کے ریشوں سے نہیں نکال سکتی غیر معمولی (Abnormal) افراد کو چھوڑ کر ایک اوسط درجے کا آدمی اپنے دل و دماغ اور دست و بازو کی تمام طاقتیں صرف اسی کام میں خرچ کرتا ہے اور کر سکتا ہے، جس سے اس کو خود اپنے مفاد کے لیے ذاتی دلچسپی ہوتی ہے۔ اگر سرے سے یہ دلچسپی ہی باقی نہ رہے اور اس کو معلوم ہو کہ اس کے لیے فوائد و منافع کی جو حد مقرر کر دی گئی ہے، اس سے بڑھ کر وہ اپنی جدّ و جہد سے کچھ بھی حاصل نہ کر سکے گا تو اس کے قوائے فکر و عمل ٹھٹھر کر رہ جائیں گے۔ اور وہ محض ایک مزدور کی طرح کام کرے گا، جس کو اپنے کام سے بقدر اجرت ہی دلچسپی ہوتی ہے۔ یہ اشتراکی نظام کا باطنی پہلو ہے۔ اس کا خارجی اور عملی پہلو یہ ہے کہ وہ سرمایہ دار افراد کا خاتمہ کر کے ایک بہت بڑے سرمایہ دار کو وجود میں لاتا ہے یعنی اشتراکی حکومت۔ یہ بڑا سرمایہ دار لطیف انسانی جذبات کی

---

(۱) اشتراکیت کو نظری طور پر ابتداً اس حقیقت سے انکار تھا بلکہ اس کے انتہا پسند فلسفی تو یہاں تک کہہ گزرے کہ انسان اپنے اندر کسی قسم کے پیدائشی رجحانات نہیں رکھتا۔ سب کچھ ماحول کی پیداوار ہے اور تعلیم و تربیت سے ہم افراد میں وہ اجتماعی ذہنیت (Social Mindedness) پیدا کر سکتے ہیں جو خود غرضانہ رجحانات سے خالی ہو۔ مگر تجربہ نے اشتراکی حضرات کی اس غلط فہمی کو آخر کار رفع کر دیا۔ اب روس میں کارکنوں کو عمل پر ابھارنے کے لیے ان کے ذاتی مفاد سے اپیل کرنے کی نت نئی تدبیریں اختیار کی جا رہی ہیں۔

اس اقلِ قلیل مقدار سے بھی خالی ہوتا ہے جو سرمایہ دار افراد میں پائی جاتی ہے۔ وہ بالکل ایک مشین کی طرح پورے استبداد کے ساتھ ان کے درمیان اسبابِ حیات تقسیم کرتا ہے، اس کے پاس نہ ہمدردی ہے، نہ قدر و اعتراف، وہ انسانوں سے انسانوں کی طرح کام نہیں لیتا بلکہ مشین کے کل پرزوں کی طرح کام لیتا ہے اور ان سے فکر و رائے اور عمل کی آزادی بالکل سلب کر لیتا ہے۔ اس شدید استبداد کے بغیر نظامِ اشتراکی نہ قائم ہوسکتا ہے نہ قائم رہ سکتا ہے۔ کیوں کہ افراد کی فطرت اس نظام کے خلاف ہر وقت آمادۂ بغاوت رہتی ہے۔ اگر ان کو دائماً استبداد کے آہنی پنجے میں جکڑ کر نہ رکھا جائے تو وہ اشتراکی نظم کو دیکھتے دیکھتے منتشر کر دیں۔ یہی وجہ ہے کہ آج روس کی سوویت گورنمنٹ دنیا کی حکومتوں میں سب سے زیادہ مستبد اور جابر ہے۔ اور اپنی رعیت کو اس نے ایسے سخت آہنی شکنجے میں جکڑ رکھا ہے، جس کی مثال دنیا کی کسی شخصی یا جمہوری حکومت میں نہیں ملتی۔ اس کا یہ جبر و استبداد کچھ اس وجہ سے نہیں ہے کہ محض بخت و اتفاق نے اسٹالن جیسے ڈکٹیٹر کو پیدا کر دیا بلکہ درحقیقت اشتراکیت کا مزاج ہی ایک شدید ترین ڈکٹیٹر شپ کا مقتضی ہے۔

نظامِ اسلامی

اسلام ان دو متضاد معاشی نظریات کے درمیان ایک معتدل نظام قائم کرتا ہے جس کا اصل الاصول یہ ہے کہ فرد کو اس کے پورے پورے شخصی و فطری حقوق بھی دیے جائیں اور اس کے ساتھ تقسیم ثروت کا توازن بھی بگڑنے نہ دیا جائے۔ ایک طرف تو وہ فرد کو شخصی ملکیت کا حق اور اپنے مال میں تصرّف کرنے کے اختیارات دیتا ہے اور دوسری طرف وہ ان سب حقوق و اختیارات پر باطن کی راہ سے کچھ ایسی اخلاقی پابندیاں اور ظاہر کی راہ سے کچھ ایسی قانونی پابندیاں عائد کر دیتا ہے جن کا مقصد یہ ہے کہ کسی جگہ وسائلِ ثروت کا غیر معمولی اجتماع نہ ہو سکے۔ ثروت اور اس کے وسائل ہمیشہ گردش کرتے رہیں، اور گردش ایسی ہو کہ جماعت کے ہر فرد کو اس کا متناسب حصّہ مل سکے۔ اس مقصد کے لیے اس نے معیشت کی تنظیم ایک نئے ڈھنگ پر کی ہے جو اپنی روح اور اپنے اصول اور اپنے طریقِ کار کے اعتبار سے سرمایہ داری اور اشتراکیت دونوں سے مختلف ہے۔

اسلام کا معاشی نظریہ مختصر الفاظ میں یہ ہے کہ معاشی زندگی میں ہر ہر فرد کا شخصی مفاد اور تمام افراد کا اجتماعی مفاد ایک دوسرے کے ساتھ گہرا ربط رکھتا ہے۔ اس لیے دونوں میں مزاحمت کے بجائے موافقت اور معاونت ہونی چاہیے۔ فرد اگر اجتماعی مفاد کے خلاف جدّوجہد کرکے

جماعت کی دولت اپنے پاس سمیٹ لے اور اس کو جمع رکھنے یا خرچ کرنے میں محض ذاتی مفاد کو ملحوظ رکھے تو یہ صرف جماعت ہی کے لیے نقصان دہ نہیں ہے بلکہ مآلِ کار میں اس کے نقصانات خود اس شخص کی اپنی ذات کی طرف بھی عود کرتے ہیں۔ اسی طرح اگر جماعت کا نظام ایسا ہو کہ وہ اجتماعی مفاد کے لیے افراد کے شخصی مفاد کو قربان کر دے تو اس میں صرف افراد ہی کا نقصان نہیں ہے بلکہ مآل کار میں جماعت کا بھی نقصان ہے۔ پس فرد کی بہتری اس میں ہے کہ جماعت خوشحال ہو اور جماعت کی بہتری اس میں ہے کہ افراد خوشحال ہوں، اور دونوں کی خوشحالی اس پر موقوف ہے کہ افراد میں خود غرضی اور ہمدردی کا صحیح تناسب قائم ہو، ہر شخص اپنے ذاتی فائدے کے لیے جدّوجہد کرے مگر اس طرح کہ اس میں دوسروں کا نقصان نہ ہو۔ ہر شخص جتنا کما سکے کمائے، مگر اس کی کمائی میں دوسروں کا بھی حق ہو، ہر شخص دوسروں سے خود بھی نفع حاصل کرے اور دوسروں کو نفع پہنچائے بھی، منافع کی اس تقسیم اور دولت کی اس گردش کو جاری رکھنے کے لیے محض افراد کے باطن میں چند اخلاقی اوصاف پیدا کر دینا کافی نہیں ہے بلکہ اس کے ساتھ جماعت کا قانون بھی ایسا ہونا چاہیے جو مال کے اکتساب اور خرچ دونوں کی صحیح تنظیم کر دے، جس کے ماتحت کسی کو مضرّت رساں طریقوں سے دولت کمانے کا حق نہ ہو اور جو دولت جائز ذرائع سے کمائی جائے وہ ایک جگہ سمٹ کر نہ رہ جائے بلکہ اور زیادہ سے زیادہ گردش کرے۔

اس نظریے پر جس نظم معیشت کی بنیاد رکھی گئی ہے اس کا مقصد نہ تو یہ ہے کہ چند افراد کروڑ پتی بن جائیں اور باقی تمام لوگ فاقے کریں، اور نہ اس کا یہ مقصد ہے کہ کوئی کروڑ پتی بن سکے، اور جبراً سب کو ان کے فطری تفاوت کے باوجود ایک حال میں کر دیا جائے۔ ان دونوں انتہاؤں کے بین بین اس کا مقصد صرف یہ ہے کہ جماعت کے تمام افراد کی معاشی ضروریات پوری ہوں۔ اگر ہر شخص دوسروں کو نقصان پہنچائے بغیر اپنی فطری حد کے اندر رہ کر اکتسابِ مال کی کوشش کرے اور پھر اپنے کمائے ہوئے مال کو خرچ کرنے میں کفایت شعاری اور امداد باہمی کو ملحوظ رکھے تو سوسائٹی میں وہ معاشی ناہمواری پیدا نہیں ہو سکتی جو سرمایہ داری کے نظام میں پائی جاتی ہے، کیوں کہ اس قسم کا طرز معیشت اگرچہ کسی کو کروڑ پتی بننے سے نہیں روکتا مگر اس کے ماتحت یہ بھی ناممکن ہے کہ کروڑ پتی اس کے ہزاروں ابناء نوع کی فاقہ کشی کا نتیجہ ہو، دوسری طرف یہ طرزِ معیشت تمام افراد کو خدا کی پیدا کی ہوئی دولت میں سے حصہ ضرور دلانا چاہتا ہے مگر ایسی مصنوعی بندشیں لگانا جائز نہیں رکھتا جن کی وجہ سے کوئی شخص اپنی قوت و قابلیت کے مطابق اکتساب مال نہ کر سکتا ہو۔

اسلام کا اقتصادی نظام

انسان کی معاشی زندگی کو انصاف اور راستی پر قائم رکھنے کے لیے اسلام نے چند اصول اور چند حدود مقرر کیے ہیں تاکہ دولت کی پیدائش، استعمال اور گردش کا سارا نظام ان ہی خطوں کے اندر چلے جو اس کے لیے کھینچ دیے گئے ہیں۔ دولت کی پیداوار کے طریقے اور اس کی گردش کی صورتیں کیا ہوں، اسلام کو اس سوال سے کوئی بحث نہیں ہے۔ یہ چیزیں تو مختلف زمانے میں تمدّن کے نشوونما کے ساتھ بنتی اور بدلتی رہتی ہیں۔ ان کا تعین انسانی حالات وضروریات کے لحاظ سے خود بخود ہو جاتا ہے۔ اسلام جو کچھ چاہتا ہے وہ یہ ہے کہ تمام زمانوں اور حالات میں انسان کے معاشی معاملات جو شکلیں بھی اختیار کریں، ان میں یہ اصول مختلف طور پر قائم رہیں اور ان حدود کی لازماً پابندی کی جائے۔

انسان کا پیدائشی حق

اسلامی نقطۂ نظر سے زمین اور اس کی سب چیزیں خدا نے نوع انسانی کے لیے بنائی ہیں اس لیے ہر انسان کا یہ پیدائشی حق ہے کہ زمین سے اپنا رزق حاصل کرنے کی کوشش کرے۔ اس حق میں تمام انسان برابر کے شریک ہیں۔ کسی کو اس حق سے محروم نہیں کیا جاسکتا۔ نہ کسی کو اس معاملے میں دوسروں پر ترجیح حاصل ہوسکتی ہے۔ کسی شخص یا کسی نسل یا طبقے پر ایسی کوئی پابندی ازروئے شرع عائد نہیں ہوسکتی کہ وہ رزق کے وسائل میں سے بعض کو استعمال کرنے کا حقدار ہی نہ رہے، یا بعض پیشوں کا دروازہ اس کے لیے بند کر دیا جائے۔ اسی طرح امتیازات بھی شرعاً قائم نہیں ہو سکتے، جن کی بنا پر کوئی ذریعۂ معاش یا وسیلۂ رزق کسی مخصوص طبقے یا نسل یا خاندان کا اجارہ

بن کر رہ جائے۔ خدا کی بنائی ہوئی زمین پر اس کے بنائے ہوئے وسائل رزق میں سے اپنا حصّہ حاصل کرنے کی کوشش کرنا سب انسانوں کا یکساں حق ہے۔ اور اس کوشش کے مواقع سب کے لیے یکساں کھلے ہونے چاہئیں۔

صلائے عام

قدرت کی جن نعمتوں کو تیار کرنے یا کارآمد بنانے میں کسی کی محنت وقابلیت کا کوئی دخل نہ ہو، وہ سب انسانوں کے لیے مباح عام ہیں۔ ہر شخص کو حق ہے کہ اپنی ضرورت بھران سے فائدہ اٹھائے۔ دریاؤں اور چشموں کا پانی، جنگل کی لکڑی، قدرتی درختوں کے پھل، خودرو گھاس اور چارہ، ہوا اور پانی اور صحرا کے جانور، سطح زمین پر کھلی ہوئی کانیں، اس قسم کی چیزوں پر نہ تو کسی کی اجارہ داری قائم ہوسکتی ہے اور نہ ایسی پابندیاں لگائی جاسکتی ہیں کہ بندگانِ خدا کچھ دیے بغیر ان سے اپنی ضروریات پوری نہ کرسکیں۔ ہاں جو لوگ تجارتی اغراض کے لیے بڑے پیمانے پر ان میں سے کسی چیز کو استعمال کرنا چاہیں، ان پر ٹیکس لگایا جاسکتا ہے۔

خدا نے جو چیزیں انسان کے فائدے کے لیے بنائی ہیں انہیں لے کر بیکار ڈال رکھنا صحیح نہیں ہے۔ یا تو ان سے خود فائدہ اٹھاؤ، ورنہ چھوڑ دو، تاکہ دوسرے ان سے متمتع ہوں۔ اسی اصول کی بنا پر اسلامی قانون یہ فیصلہ کرتا ہے کہ کوئی شخص اپنی زمین کو تین سال سے زیادہ مدّت تک افتادہ حالت میں نہیں رکھ سکتا، اگر وہ اس کو زراعت یا عمارت یا کسی دوسرے کام میں استعمال نہ کرے تو تین سال گزر جانے کے بعد وہ متروکہ زمین سمجھی جائے گی۔ کوئی دوسرا شخص اسے کام میں لے آئے تو اس پر دعویٰ نہ کیا جاسکے گا اور اسلامی حکومت کو بھی یہ اختیار ہوگا کہ اس زمین کو کسی کے حوالے کردے۔

مالکانہ حقوق

جو شخص براہِ راست قدرت کے خزانے میں سے کوئی چیز لے اور اپنی محنت اور قابلیت سے اس کو کارآمد بنائے وہ اس چیز کا مالک ہے۔ مثلاً افتادہ زمین کو جس پر کسی کے حقوقِ ملکیت ثابت نہ ہوں، اگر کوئی شخص اپنے قبضہ میں لے لے اور کسی مفید کام میں اسے استعمال کرنا شروع کردے تو اس کو بے دخل نہیں کیا جاسکتا۔ اسلامی نظریے کے مطابق دنیا میں تمام مالکانہ حقوق کی

ابتدا اسی طرح ہوئی ہے۔ پہلے پہل جب زمین پر انسانی آبادی شروع ہوئی تو سب چیزیں سب انسانوں کے لیے مباح عام تھیں۔ پھر جس شخص نے جس مباح چیز کو اپنے قبضہ میں لے کر کسی طور پر کارآمد بنالیا وہ اس کا مالک ہوگیا، یعنی اسے یہ حق حاصل ہوگیا کہ اس کا استعمال اپنے لیے مخصوص رکھے اور دوسرے اسے استعمال کرنا چاہیں تو ان سے اس کا معاوضہ لے۔ یہ چیز انسان کے سارے معاشی معاملات کی فطری بنیاد ہے اور اس بنیاد کو اپنی جگہ قائم رہنا چاہیے۔

احترام کے قابل مالکانہ حقوق

جائز شرعی طریقوں سے جو مالکانہ حقوق کسی کو دنیا میں حاصل ہوں وہ بہرحال احترام کے مستحق ہیں۔ کلام اگر ہوسکتا ہے تو اس امر میں ہوسکتا ہے کہ کوئی ملکیت شرعاً صحیح ہے یا نہیں؟ جو ملکیتیں از روئے شرع ناجائز ہوں انہیں بیشک ختم ہونا چاہیے، مگر جو ملکیتیں شرعاً صحیح ہوں، کسی حکومت اور کسی مجلسِ قانون ساز کو یہ حق نہیں کہ انہیں سلب کرلے یا ان کے مالکوں کے شرعی حقوق میں کسی قسم کی کمی بیشی کرے۔ اجتماعی بہتری کا نام لے کر کوئی ایسا نظام قائم نہیں کیا جاسکتا جو شریعت کے دیے ہوئے حقوق کو پامال کرنے والا ہو۔ جماعت کے مفاد کے لیے افراد کی ملکیتوں پر جو پابندیاں شریعت نے خود ہی لگادی ہیں ان میں کمی کرنا جتنا بڑا ظلم ہے اتنا ہی بڑا ظلم ان پر اضافہ کرنا بھی ہے۔ یہ بات اسلامی حکومت کے فرائض میں سے ہے کہ وہ افراد کے شرعی حقوق کی حفاظت کرے اور ان سے جماعت کے لیے وہ حقوق وصول کرے جو شریعت نے ان پر عائد کیے ہیں۔

فطری مساوات اور مصنوعی مساوات

خدا نے اپنی نعمتوں کی تقسیم میں مساوات ملحوظ نہیں رکھی ہے بلکہ اپنی حکمت کی بنا پر بعض انسانوں کو بعض پر فضیلت دی ہے۔ حسن، خوش آوازی، تندرستی، جسمانی طاقتیں، دماغی قابلیتیں، پیدائشی ماحول اور اسی طرح کی دوسری چیزیں سب انسانوں کو یکساں نہیں ملی ہیں، ایسا ہی معاملہ رزق کا بھی ہے۔ خدا کی بنائی ہوئی فطرت خود اس بات کی متقاضی ہے کہ انسان کے درمیان رزق میں تفاوت ہو، لہٰذا وہ تمام تدبیریں اسلامی نقطۂ نظر سے مقصد اور اصول میں غلط ہیں جو انسانوں کے درمیان ایک مصنوعی معاشی مساوات قائم کرنے کے لیے اختیار کی جائیں،

اسلام جس مساوات کا قائل ہے وہ رزق میں مساوات نہیں بلکہ حصول رزق کی جدّوجہد کے مواقع میں مساوات ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ سوسائٹی میں ایسی قانونی اور رواجی رکاوٹیں باقی نہ رہیں جن کی بنا پر کوئی شخص اپنی قوت واستعداد کے مطابق معاشی جدّوجہد نہ کرسکتا ہو اور ایسے امتیازات بھی قائم نہ رہیں جو بعض طبقوں، نسلوں اور خاندانوں کی پیدائشی خوش نصیبی، مستقل قانونی تحفظات میں تبدیل کردیتے ہوں۔ یہ دونوں طریقے فطری نامساوات کی جگہ زبردستی ایک مصنوعی مساوات قائم کرتے ہیں۔ اس لیے اسلام انہیں مٹا کر سوسائٹی کے معاشی نظام کو ایسی فطری حالت پر لے آنا چاہتا ہے جس سے ہر شخص کے لیے کوشش کے مواقع کھلے ہوں۔ مگر جو لوگ چاہتے ہیں کہ کوشش کے ذرائع اور نتائج میں بھی سب لوگوں کو زبردستی برابر کردیا جائے، اسلام ان سے متفق نہیں ہے کیوں کہ وہ فطری نامساوات کو مصنوعی مساوات میں تبدیل کرنا چاہتے ہیں۔ فطرت سے قریب تر صرف وہی نظام ہوسکتا ہے جس میں ہر شخص معیشت کے میدان میں دوڑ کی ابتداء اسی مقام کی اسی حالت سے کرے جس پر خدا نے اسے پیدا کیا ہے۔ جو موٹر لیے ہوئے آیا ہے وہ موٹر پر ہی چلے، جو صرف دو پاؤں لایا ہے وہ پیدل ہی چلے اور جو لنگڑا پیدا ہوا ہے وہ لنگڑا ہی چلنا شروع کردے۔ سوسائٹی کا قانون نہ تو ایسا ہونا چاہیے کہ وہ موٹر والے کا مستقل اجارہ موٹر پر قائم کردے اور لنگڑے کے لے موٹر کا حصول ناممکن بنادے اور نہ ایسا ہی ہونا چاہیے کہ سب کی دوڑ زبردستی ایک ہی مقام اور ایک ہی حالت سے شروع اور آگے تک انہیں لازماً ایک دوسرے کے ساتھ باندھ رکھا جائے۔ برعکس اس کے قوانین ایسے ہونے چاہئیں جن میں اس امر کا کھلا امکان موجود رہے کہ جس نے اپنی دوڑ لنگڑا کر شروع کی تھی وہ اپنی محنت اور قابلیت سے موٹر پاسکتا ہو تو ضرور پائے اور جو ابتداء میں موٹر پر چلا تھا وہ بعد میں اپنی نااہلی سے لنگڑا ہو کر رہ جائے تو رہ جائے۔

امداد باہمی کے فطری طریقے

اسلام صرف اتنا ہی نہیں چاہتا کہ اجتماعی زندگی میں یہ معاشی دوڑ کھلی اور بے لاگ ہو، بلکہ یہ بھی چاہتا ہے کہ اس میدان میں دوڑنے والے ایک دوسرے کے لیے بے رحم اور بے درد نہ ہوں۔ ہمدرد اور مددگار رہوں۔ وہ ایک طرف اپنی اخلاقی تعلیم سے لوگوں میں یہ ذہنیت پیدا کرتا ہے کہ اپنے درماندہ اور پس ماندہ بھائیوں کو سہارا دیں۔ دوسری طرف وہ تقاضا کرتا ہے کہ سوسائٹی

میں ایک مستقل ادارہ ایسا موجود ہے جو معذور اور بے وسیلہ لوگوں کی مدد کا ضامن ہو۔ جو لوگ معاشی دوڑ میں حصّہ لینے کے قابل نہ ہوں، وہ اس ادارے میں سے اپنا حصّہ پائیں جو لوگ اتفاق زمانہ سے اس دوڑ میں گر پڑے ہوں، انہیں یہ ادارہ اٹھا کر پھر چلنے کے قابل بنائے اور جن لوگوں کو جدّوجہد کے میدان میں اترنے کے لیے سہارے کی ضرورت ہو انہیں اس ادارے سے سہارا ملے۔ اس مقصد کے لیے اسلام نے ازروئے قانون یہ طے کیا ہے کہ ملک کی تمام جمع شدہ دولت پر ڈھائی فی صدی سالانہ اور اسی طرح پورے تجارتی سرمایے پر بھی ڈھائی فی صدی سالانہ زکوٰۃ وصول کی جائے۔ تمام عشری زمینوں کی زرعی پیداوار کا دس فی صدی یا پانچ فی صدی حصّہ لیا جائے۔ بعض معدنیات کی پیداوار کا بیس فی صدی حصّہ لیا جائے۔ اور یہ تمام سرمایہ غریبوں، یتیموں اور محتاجوں کی مدد کے لیے استعمال کیا جائے۔ یہ ایک ایسی اجتماعی انشورنس ہے جس کی موجودگی میں اسلامی سوسائٹی کے اندر کوئی شخص زندگی کی ناگزیر ضروریات سے محروم نہیں رہ سکتا۔ کوئی محنت کش آدمی کبھی اتنا مجبور نہیں ہو سکتا کہ فاقے کے ڈر سے خدمت کی وہی شرائط منظور کرے جو کارخانہ دار یا زمیندار پیش کر رہا ہو۔ کسی شخص کی طاقت اس کم سے کم معیار سے کبھی نیچے نہیں گر سکتی جو معاشی جدّوجہد میں حصّہ لینے کے لیے ضروری ہے۔

فرد کی آزادی کا احترام

فرد اور جماعت کے درمیان اسلام ایسا توازن قائم کرنا چاہتا ہے، جس میں فرد کی شخصیت اور اس کی آزادی بھی برقرار رہے اور اجتماعی مفاد کے لیے اس کی آزادی نقصان دہ بھی نہ ہو، بلکہ لازمی طور پر مفید ہو۔ اسلام کسی ایسی سیاسی یا معاشی تنظیم کو پسند نہیں کرتا جو فرد کو جماعت میں گم کر دے اور اس کے لیے وہ آزادی باقی نہ چھوڑے جو اس کی شخصیت کے صحیح نشوونما کے لیے ضروری ہے۔ کسی ملک کے تمام ذرائع پیداوار کو قومی ملکیت بنا دینے کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ ملک کے تمام افراد جماعتی شکنجہ میں جکڑ جائیں۔ اس حالت میں اس کی انفرادیت کا بقا اور ارتقا سخت مشکل بلکہ غیر ممکن ہے۔ انفرادیت کے لیے جس طرح سیاسی آزادی ضروری ہے اسی طرح معاشی آزادی بھی بہت بڑی حد تک ضروری ہے۔ اگر ہم آدمیت کا بالکل استیصال نہیں کر دینا چاہتے تو ہماری اجتماعی زندگی میں اتنی گنجائش ضرور رہنی چاہیے کہ ایک بندۂ خدا اپنی روزی

آزادانہ پیدا کر کے اپنے ضمیر کا استقلال برقرار رکھ سکے اور اپنی ذہنی و اخلاقی قوتوں کو اپنے رجحانات کے مطابق نشوونما دے سکے۔ راتب بندی کا رزق جس کی کنجیاں دوسروں کے ہاتھ میں ہوں، اگر فراواں بھی ہوں تو خوش گوار نہیں۔ کیوں کہ اس سے پرواز میں کوتاہی آتی ہے محض جسم کی فربہی اس کی تلافی نہیں کر سکتی۔

بے لگام آزادی کی روک تھام

جس طرح اسلام ایسے نظام کو ناپسند کرتا ہے اسی طرح وہ ایسے اجتماعی نظام کو بھی پسند نہیں کرتا جو افراد کو معاشرت اور معیشت میں بے لگام آزادی دیتا ہے اور انہیں کھلی چھٹی دے دیتا ہے کہ اپنی خواہشات یا اپنے مفاد کی خاطر ریاست کو جس طرح چاہیں نقصان پہنچائیں۔ ان دونوں انتہاؤں کے درمیان اسلام نے جو متوسط راہ اختیار کی ہے وہ یہ ہے کہ پہلے فرد کو جماعت کی خاطر چند حدود اور ذمہ داریوں کا پابند بنایا جائے، پھر اسے اپنے معاملات میں آزاد چھوڑ دیا جائے اور حدود اور ذمہ داریوں کی ساری تفصیل بیان کرنے کا یہاں موقع نہیں ہے، میں ان کا صرف مختصر سا نقشہ آپ کے سامنے پیش کروں گا۔

جائز و ناجائز کسبِ معاش

پہلے کسبِ معاش کو لیجیے۔ دولت کمانے کے ذرائع میں اسلام نے جتنی باریک بینی کے ساتھ جائز و ناجائز کی تفریق کی ہے اتنی دنیا کے کسی قانون نے نہیں کی۔ وہ چن چن کر ان تمام ذرائع کو حرام قرار دیتا ہے، جن سے ایک شخص دوسرے اشخاص کو یا بحیثیت مجموعی پوری سوسائٹی کو اخلاقی یا مادّی نقصان پہنچا کر اپنی روزی حاصل کرتا ہے، شراب اور نشہ آور چیزوں کا بنانا اور بیچنا، فحش کاری اور رقص و سرود کا پیشہ، جوا، سٹہ، لاٹری، سود، قیاس اور دھوکہ اور جھگڑے کے سودے ایسے تجارتی طریقے جن میں ایک فریق کا فائدہ یقینی اور دوسرے کا مشتبہ ہو، ضرورت کی چیزوں کو روک کر ان کی قیمت چڑھانا اور بہت سے وہ کاروبار جو اجتماعی طور پر ضرر رساں ہیں، اسلامی قانون میں قطعی طور پر حرام کر دیے گئے ہیں۔ اس معاملے میں اگر آپ اسلام کے معاشی قانون کا جائزہ لیں تو حرام طریقوں کی ایک طویل فہرست آپ کے سامنے آئے گی اور ان میں بہت سے وہ طریقے آپ کو ملیں گے جنہیں استعمال کر کے ہی موجودہ سرمایہ داری نظام میں لوگ

کروڑ پتی بنتے ہیں، اسلام ان سب طریقوں کو از روئے قانون بند کرتا ہے اور آدمی کو صرف ان طریقوں سے دولت کمانے کی آزادی دیتا ہے جن سے وہ دوسروں کی کوئی مفید خدمت انجام دے کر انصاف کے ساتھ اس کا معاوضہ حاصل کرے۔

آمدنی اور خرچ پر ضروری پابندی

حلال ذرائع سے کمائی ہوئی دولت پر اسلام آدمی کے حقوقِ ملکیت تسلیم کرتا ہے مگر یہ حقوق بھی غیر محدود نہیں ہیں۔ وہ آدمی کو پابند کرتا ہے کہ اپنی حلال کمائی کو خرچ بھی جائز راستوں ہی میں کرے۔ خرچ پر اس نے ایسی قیود لگادی ہیں جن سے آدمی ایک ستھری اور پاکیزہ زندگی تو بسر کرسکتا ہے مگر عیاشیوں میں دولت اڑا نہیں سکتا۔ نہ شوکت وشان کے اظہار میں اس قدر حد سے گزر سکتا ہے کہ دوسروں پر اس کی خدائی کا سکہ جمنے لگے۔ بیجا خرچ کی بعض صورتوں کو تو اسلامی قانون میں صراحتاً ممنوع ٹھہرایا گیا ہے اور بعض دوسری صورتوں کی اگرچہ صراحت نہیں ہے لیکن اسلامی حکومت کو یہ اختیارات حاصل ہیں کہ اپنی دولت میں ناروا تصرّفات کرنے سے لوگوں کو حکماً روک دے۔ جائز اور معقول اخراجات سے جو دولت آدمی کے پاس بچے اسے وہ جمع بھی کرسکتا ہے اور مزید دولت پیدا کرنے میں بھی لگا سکتا ہے مگر ان دونوں حقوق پر پابندیاں ہیں۔ جمع کرنے کی صورت میں اسے نصاب سے زائد دولت پر ڈھائی فی صدی سالانہ زکوٰۃ دینی ہوگی۔ کاروبار خواہ آدمی خود کرے یا کسی دوسرے کو اپنا سرمایہ، روپے، زمین، یا آلات کی صورت میں دے کر نفع نقصان کا شریک ہوجائے، یہ دونوں صورتیں جائز ہیں۔ ان حدود کے اندر کام کرکے اگر کوئی شخص کروڑ پتی بھی بن جائے تو اسلام کی نگاہ میں یہ کوئی قابلِ اعتراض چیز نہیں ہے بلکہ خدا کا انعام ہے۔ لیکن جماعتی مفاد کے لیے وہ اس پر دو شرطیں عائد کرتا ہے۔ ایک یہ کہ وہ اپنے تجارتی مال پر زکوٰۃ اور زرعی پیداوار پر عُشر ادا کرے، دوسرے یہ کہ وہ اپنی تجارت یا صنعت یا زراعت میں جن لوگوں کے ساتھ شرکت یا اجرت کا معاملہ کرے ان سے انصاف کرے۔ یہ انصاف اگر وہ خود نہ کرے گا تو اسلامی حکومت اسے انصاف پر مجبور کردے گی۔

دولت کا پھیلاؤ

پھر جو دولت ان جائز حدود کے اندر فراہم ہو، اس کو بھی اسلام زیادہ دیر تک سمٹا نہیں

رہنے دیتا۔ بلکہ اپنے قانون وراثت کے ذریعے سے ہر پشت کے بعد دوسری پشت اسے پھیلا دیتا ہے۔ اس معاملہ میں اسلامی قانون کا رجحان دنیا کے تمام دوسرے قوانین کے رجحانات سے مختلف ہے۔

دوسرے قوانین کوشش کرتے ہیں کہ جو دولت ایک مرتبہ سمٹ چکی ہے وہ پشت در پشت سمٹی ہی رہے۔ برعکس اس کے اسلام ایسا قانون بناتا ہے کہ جو دولت ایک شخص نے اپنی زندگی میں فراہم کی ہو وہ اس کے مرتے ہی اس کے عزیزوں میں بانٹ دی جائے، قریبی عزیز نہ ہوں تو دور کے رشتہ دار حصہ رسدی اس کے وارث ہوں۔ اور اگر کوئی دور پرے کا رشتہ دار بھی نہ ہو تو پھر پوری مسلم سوسائٹی اس کی حق دار ہے۔

یہ قانون کسی بھی جاگیرداری و زمینداری کو مستقل اور قائم نہیں رہنے دیتا پچھلی ساری پابندیوں کے باوجود دولت کے سمٹاؤ سے کوئی خرابی پیدا ہو بھی جائے تو آخری ضرب اس کا ازالہ کر دیتی ہے۔